

أُسْوَةٌ دُعْوَةٌ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اسوہ دعوت

نبی کریم ﷺ کا ہر نقش، ہر قدم، ہر ادا، ہر بات اور ہر عمل ہمارے لیے بہترین اسوہ، قابل عمل نمونہ اور مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید نے خود اس بات کو بیان فرمایا ہے کہ تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ کی ذات میں بہترین اسوہ ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاذاب: ۲۱)۔ یہ اس لیے بھی ہے کہ اللہ کا رسول آتا ہی اس لیے ہے کہ اس کی پیروی و اطاعت کی جائے۔ یہ اطاعت و پیروی

یہ واحد چیز ہے، جس میں اللہ کے رسول کی اطاعت، اللہ کی اطاعت کے برابر ہے۔ جس نے رسول کی اطاعت کی، وراثل اس نے خدا کی اطاعت کی: مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (التساء: ۸۰) رسول کی اتباع اور پیروی محض اللہ کی اطاعت ہی نہیں ہے بلکہ اللہ کی محبت کی نشانی بھی ہے:

قُلْ إِنَّكُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحِبِّكُمُ اللَّهُ وَ
يَغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ

(آل عمران: ۳۱)

اے نبی ﷺ، لوگوں سے کہہ دو کہ ”اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری خطاؤں سے درگز رفرمائے گا۔“

یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ آپ ﷺ کے رسول ہیں، بلکہ اس لیے کہ آپ ﷺ کا اسوہ کامل ترین اسوہ ہے: إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (آل قلم: ۲۳) گویا

آپ ﷺ کا کردار اور آپ ﷺ کی سیرت انسانوں کے لیے ہر لحاظ اور ہر پہلو سے بہترین اور کامل نمونہ اور مثال ہے۔

رسالت اور اسوہ کامل، یہ دونوں باتیں لازم و ملزم ہیں۔ اس لیے کہ جو اللہ کا رسول ہو گا وہ لازماً اسوہ کامل کا حامل بھی ہو گا اور جو اسوہ کامل کا حامل ہو گا، اسی کو اللہ تعالیٰ اپنی رسالت کے لیے منتخب فرمائے گا۔ لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ کے اللہ کے رسول ہونے میں ہی تمہارے لیے بہترین اسوہ ہے۔ اس لیے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی کے بہت سارے پہلو ہیں۔ آپ ﷺ سربراہ ریاست بھی تھے اور قانون ساز بھی، باپ بھی تھے اور شوہر بھی، دوست اور ساتھی بھی تھے اور فوجوں کے سپاہ سالار بھی، نیز معلم و مرتبی بھی، اور یہ ساری حیثیتیں آپ ﷺ کی رسالت کی حیثیت کے تابع تھیں۔ اس لحاظ سے قرآن مجید نے جب یہ کہا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو جہاں یہ بات واضح اور صاف ہو گئی کہ اللہ کے رسول ﷺ ہونے کی حیثیت سے آپ ﷺ کا اسوہ قابل اتباع ہے،

وہاں یہ بات بھی عیاں ہو گئی کہ اللہ کے رسول ہونے کی حیثیت سے رسالت کا فریضہ ادا کرنے میں اور کارِ رسالت انجام دینے میں بھی آپ ﷺ کا طریقہ، آپ ﷺ کی روش اور آپ ﷺ کا اسوہ ہی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔

کا ور رسالت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا کو شاہد اور مبشر اور نذیر اور داعی الی اللہ بنانا کر بھیجا۔ اس حوالے سے انبیا کی، جس صفت پر بھی غور کیا جائے، اس کا حاصل یہی ہے کہ اللہ کے بندوں تک اللہ کی ہدایت اور اس کا پیغام پہنچے۔ رسول کے لفظ کے اندر یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ پیغامبر وہ ہوتا ہے، جو پیغام لے کر آتا ہے اور اسے دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ یہ ایک ایسی ذمہ داری ہے کہ اللہ کے رسول کوئی اور کام کر پائیں یا نہ کر پائیں لیکن ان سے ان کی اس بنیادی ذمہ داری کے بارے میں لازماً سوال کیا جائے گا کہ تم نے اس کو کہاں تک ادا کیا۔ لوگ مانتے ہیں یا نہیں مانتے، چلتے ہیں یا نہیں چلتے، پکار پر بلیک کہتے ہیں یا نہیں کہتے اور اللہ کے رسول اس میں کام یاب ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے کہ اللہ کے دین کو سارے ادیان پر غالب کر دیں،

لیکن یہ فریضہ ایسا ہے کہ جو بنیادی طور پر لازماً ان کے ذمے کیا گیا ہے۔

تَبَأَّلَهَا الرَّسُولُ بَلَغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ

(الملائکہ: ۶۷)

”اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ
لوگوں تک پہنچا دو۔“

گویا اگر تم نے پہنچانے کا کام سرانجام نہیں دیا تو فی الواقع اللہ نے جو پیغام
دیا ہے، اس کے پہنچانے کا حق ادا نہیں ہوا۔ یوں سمجھ لیں کہ رسالت کے سارے
فرائض کا انحصار مخالفین کے اوپر ہے۔ وہ مانیں گے تو مومن وجود میں آئیں گے۔ وہ
ساتھ دیں گے تو ساتھ چلنے والے ملیں گے، لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ نوسوب رس رات
دن پکارنے کے بعد بھی تھوڑے ہی لوگ ہوں، جو ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔

وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ (ھود: ۷۰)

”اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اس (نوح علیہ السلام) کے ساتھ ایمان لائے تھے۔“

اگر دعوت کے نتیجے میں تھوڑے لوگ ایمان لا میں یا لوگ دعوت رد کر دیں تو اس پر رسول سے کوئی پرسش نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے جواب دنہیں ہے۔ البتہ جس بات میں اس کی جواب دہی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے دعوت پہنچانے کا کام اور لوگوں کو خدا کی طرف پکارنے کا کام کہاں تک کیا۔ اگر اس نے اس کام کو مکمل کر دیا تو رسالت کا سب سے بنیادی فریضہ اور اس کی بنیادی ذمہ داری ادا کر دی۔

یہ جاننا ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ اکثر دعوت دین اور اقامت دین کا کام کرتے ہوئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کام کرنا بھی ہماری ذمے داری ہے کہ جو کام دوسروں کے ماننے اور دوسروں کا ساتھ دینے اور اللہ کی خشیت اور حکمت پر منحصر ہے۔ جب وہ کام پورا نہیں ہوتا تو ہم ما یو سی کا شکار ہو کر اس کام کو بھی چھوڑ دیتے ہیں، جس کام سے کوئی مفر نہیں اور جس ذمے داری کو بھی ٹالا نہیں جا سکتا۔

وہ یہ کہ اللہ کے ایک ایک بندے تک اس کی ہدایت، اس کی زندگی کا پیغام، اس کے اوپر ایمان لانے کی دعوت، اس کی اطاعت کا مطالبہ اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہی دراصل کاررسالت کا ماحصل ہے۔ آج بھی جو اسلامی تحریک کا نام لیتا ہے، اقامتوں دین کا دعوے دار ہے، وہ کوئی اور کام کر پائے یا نہ کر پائے لیکن اس کام کے لیے اس کی ذمے داری اور اس کی جواب دہی ایسی ہے، جس سے وہ چھوٹ نہیں سکتا جب تک کہ وہ اس کام کو کا حقہ انجام نہ دے۔

اسوہ رسالت کے تحت میں مختصر ادو چیزوں کا ذکر کروں گا اور یہ دونوں چیزوں بالکل لازمی اور ناگزیر ہیں۔ دعوت کے ضمن میں ان طریقوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے لیے، جو طریقے نبی کریم ﷺ نے اختیار کیے ہیں، داعی کے لیے انھیں اپنا ضروری ہے۔ اس کام کے لیے ایک خاص جذبہ، کیفیت اور روح درکار ہے۔ اس لیے کہ دعوت کا کام کوئی مجرد فنی مہارت کا کام نہیں ہے اور اس کو عام اصولوں کی طرح نہیں سیکھا جاسکتا۔ اس کام کے طریقے، اس کام کے راستے اسی وقت

سیکھے جاسکتے ہیں اور ان پر عمل درآمد اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان کی پشت پر وہ کیفیت، وہ روح اور وہ جذبہ کا فرما ہو، جو دعوت الٰی اللہ کے لیے ضروری ہے اور جس کی نمایاں مثال نبی کریم ﷺ کی اپنی زندگی اور اپنا اسوہ دعوت ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ دعوت کی ذمے داری ایک بڑی بھاری ذمے داری ہے، جس کے احساس سے آپ ﷺ کا دل گراں بار تھا، جس کے بوجھ سے آپ ﷺ کو اپنی کمر ٹوٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی، جس کو اللہ تعالیٰ نے خود قول ثقیل (بھاری بات) سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اس لیے تھا کہ یہ ذمے داری کس کی طرف سے تھی، نیابت کس کی ہو رہی تھی، بات کس کی تھی، جو دوسروں کو پہنچانا تھی، اس کے لیے جواب وہی کس کے سامنے تھی..... یہ خود اپنے سامنے اور رب کائنات کے سامنے تھی۔ یہ ذمہ داری نہ کسی اجتماع میں روپورث تک محدود تھی، نہ یہ ذمہ داری صرف دُنیا کے اندر کچھ کام یا بی حاصل کرنے کے لیے تھی، بلکہ اللہ کے رسول اُس منصب پر اپنے رب کی طرف سے فائز کیے گئے تھے اور رب کا دیا ہوا کام ایسا تھا، جو ہر حال میں، ہر طرح انجام دینا تھا۔

مجرد یہ احساس اور شعور کہ یہ میرے رب کا کام ہے اور مجھے رب کے بندوں کو حق کی طرف بلانا ہے، ان کو غلط راستوں پر بھٹکنے سے بچا کر صحیح راستے پر لانا ہے، یہ اپنی جگہ اتنی زبردست ذمہ داری تھی کہ اقرآن کا پیغام سننے کے بعد ہی حضور ﷺ کا نپتے، لرزتے اپنے گھر واپس آئے اور اپنی اہلیہ محترمہ سے کہا کہ زملونی، زملونی، مجھے اڑھادو، مجھے اڑھادو۔ مجھے اپنے نفس کے بارے میں ڈر ہے۔ اتنا عظیم الشان کام اقرآن (پڑھنے اور سنانے) کا کام، رب کے نام سے دنیا کو پکارنے کا کام اور دنیا کو پیغام دینا کہ علم کا سرچشمہ صرف ایک ہی ذات ہے اور وہ اللہ کی ذات ہے۔ اس کے علاوہ اس سے ماوراء اور اس سے بے نیاز ہو کر جو علم کا داعوے دار ہے، وہ قطعی غلط ہے۔ اللہ کے نام سے، اللہ کی ذات سے اور اللہ کی ہدایت سے پوری انسانی زندگی کا رشتہ جوڑنا، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ^۵ (العلق: ۱) میں پوری ذمہ داری پوشیدہ تھی اور حضور ﷺ اسی لیے کا نپتے اور لرزتے ہوئے واپس آئے تھے اور یہ فرمایا تھا کہ مجھے اپنے نفس کے بارے میں ڈر اور خوف

محسوس ہوتا ہے۔ یہ اس مقامِ دعوت کی عظمت اور اس کی گرائی باری تھی، جس نے قلب مبارک پر اس کیفیت کو طاری کر دیا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ، جو چیز تھی وہ صرف یہ نہیں تھی کہ دنیا کے اندر اتنا عظیم الشان کام درپیش ہے بلکہ یہ کہ اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا، اور اگر اس کام کے اندر کوتا ہی ہوئی تو، جو لوگ گم را ہی کے راستے پہ جائیں گے، بھٹک جائیں گے اور غلط راہ پر پڑ جائیں گے، وہ جن کے سامنے جلت پوری نہیں ہوگی، اس کا ذمہ دار وہ بھی ہو گا، جس کے پاس پیغام حق ہوا اور وہ اس کو پہنچانے سے قاصر رہے۔ اسی لیے ہمیں حدیث میں بہت سارے واقعات ملتے ہیں، جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ جب اس حوالے سے سوچتے تھے یا آپ ﷺ کے سامنے اس کا ذکر ہوتا تھا تو آپ ﷺ لرزہ بر اندام ہو جاتے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔

ایک طرف تو جواب دہی کا یہ احساس تھا، جس کے بوجھ سے آپ ﷺ کو اپنی کرنٹوٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی تو دوسری طرف خود وحی کے نزول کا مرحلہ بھی بہت

کھٹھن تھا۔ اس سے صرف جسم کے اوپر وزن ہی نہیں پڑتا تھا بلکہ جب یہ کلام نازل ہوتا تھا تو اس کے بوجھ سے اونٹنی بھی بیٹھ جایا کرتی تھی اور آپ ﷺ کی پیشانی پر پینے کے قطرے نمودار ہوا کرتے تھے۔ یہ تمام کیفیات کلام حق اور ہدایت الٰہی کو وصول کر کے پہنچانے کی ذمے داری کے احساس کا نتیجہ تھیں۔

آخرت کی جواب وہی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے صاف صاف کہا تھا:

فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسَلَ إِلَيْهِمْ وَ لَنَسْأَلَنَّ
الْمُرْسَلِينَ^۸

(الاعراف: ۶)

”پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں، جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے (کہ انہوں نے پیغام رسانی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انھیں اس کا کیا جواب ملا)۔“

یہ سوال صرف انہی سے نہیں ہوگا، جو مخاطب تھے کہ تم نے یہ بات سن کر

کیوں رد کر دی، بلکہ مرسلین جن کو رسول بنا کر بھیجا گیا ان سے بھی سوال کیا جائے گا کہ تم نے اپنی ذمے داری کو کہاں تک ادا کیا۔ یہ کتنی بڑی ذمے داری تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ایسا بوجھ تھا، جس سے کمرٹی محسوس ہوتی اور جس سے بدن لرزتا اور کانپتا تھا اور جس کی جواب دہی کا احساس دل و دماغ کے اوپر چھایا رہتا تھا۔

یہ ذمے داری رب کی طرف سے تھی کہ اللہ کے بندوں کو بھٹکنے سے بچا کر صحیح راستے پر لگایا جائے۔ ذرا تصور کیجیے کہ وہ دل اور وہ قلب، جوانانوں کی محبت سے سرشار ہو، جو ۲۰ سال سے دن رات انسانوں کی خدمت کے اندر لگا ہوا ہو، اس کو جب یہ معلوم ہو کہ یہ وہ پیغام ہے، جس سے انسان آگ سے نجع کر اللہ کی جنت کی طرف جاسکتے ہیں تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس کی کیفیت کیا ہو گی۔ نبی کریم ﷺ نے اس بات کو یوں بیان فرمایا کہ میری مثال ایسی ہے جیسے کسی نے آگ جلانی اور جب آگ روشن ہو گئی تو تم لوگ پروانوں کی طرح آگ میں گرنے لگے اور میں تمھاری کمر پکڑ کر

تم کو بچا رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ کے اندر گرے جا رہے ہو۔ اگر آپ کا بچہ آگ کے قریب چلا جائے یا کسی حادثے کا شکار ہو جائے، یا بتاہی کے گڑھے پر کھڑا ہو تو آپ کے قلب کی، جو کیفیت ہو گی وہی نبی اور داعی کے قلب کی کیفیت ہوتی ہے اور ہونی چاہیے۔

ایک نبی کی حیثیت اپنی قوم کے لیے باپ کی ہوتی ہے۔ وہ کتنی ہی گم راہ کیوں نہ ہو، وہ اس کی نصیحت اور خیرخواہی سے آخر وقت تک بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ وہ اس کے اوپر غصے و ناراضی اور مایوسی کا اظہار نہیں کرتا۔ اگر وہ پھر بھی کھاتا ہے تو دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے اور صحیح راستے پر لگائے۔ وہ اپنی ذات کے لیے نہ کچھ اجر مانگتا ہے اور نہ وہ انتقام کا طالب ہوتا ہے۔ اس کی ساری محبت اور دشمنی صرف اللہ کے لیے اور اس کے پیغام کے لیے ہوتی ہے۔ اسی کیفیت کی وجہ سے نبی کریم ﷺ دن رات اسی فکر کے اندر گھلائکرتے تھے اور ہر داعی حق کو بھی گھلننا چاہیے کہ کس طرح یہ پیغام عام ہو۔ دل کی یہ فکر عمل کے اندر ظاہر ہوتی تھی۔ گھر گھر جانا،

گلیوں میں گھومنا، لوگوں کو دعوت دینا، اپنے گھر پر بلاانا اور دعوت دینا، پہاڑی پر چڑھ کے وعظ کہنا، خیموں کے اندر جانا، ہر موقع سے فائدہ اٹھانا، ہر آنے جانے والے سے موقع نکال کر حکمت کے ساتھ اپنی بات کہنا، یہ سب کس طرح ہو، اس میں آپ ﷺ دن اور رات گھلا کرتے تھے۔

آپ ﷺ کی اس کیفیت کو قرآن مجید نے مختلف الفاظ سے ظاہر کیا ہے۔
کہیں فرمایا کہ تم اپنا گلا گھونٹ ڈالو گے۔ کہیں اس کے لیے حرص کا لفظ استعمال ہوا:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا
عَنْتُمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ

(التوبہ: ۱۲۸)

”دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے، جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پرشاقد ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے۔“

گویا اس بھلائی اور دعوت حق کی طرف بلانے کے لیے تمہاری فکر، آرزو و

تمنالائج کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ جس طرح لاپچی آدمی برابر سوچ تھا رہتا ہے کہ مطلوبہ چیز کو س طرح حاصل کرے، اس کے پیچھے پڑا رہتا ہے، اپنا سب کچھ اس کے لیے لگاتا ہے، وہی کیفیت نبی کریم ﷺ کی تھی اور وہی کیفیت ہر داعی حق کی بھی ہونی چاہیے۔

اس میں نہ مایوسی کا گزر تھا اور نہ چھنجلاہٹ کا اور نہ نفرت اور اپنی قوم سے بے زاری کا اعلان، بلکہ شفقت و رحمت کے ساتھ مسلسل آپ ﷺ اس کام کے اندر لگے رہے۔ یہاں تک کہ یہ تمنا کہ جود پکھنے والے نہیں ہیں، اندھے ہیں، کسی طرح ان کو کو دکھالیں، جو سننے والے نہیں ہیں، کسی طرح ان کو سنادیں، جو بھلک رہے تھے ان کو کسی طرح صحیح راستے پر لگا دیں۔ اس کی تصویر قرآن مجید نے یوں پہنچی کہ تم اندھوں کو راستے نہیں دکھا سکتے، تم بہروں کو نہیں سنا سکتے، جو بھلک گئے ہیں تم انھیں صحیح راستے پر نہیں لگا سکتے۔ گویا جو سوچ سمجھ کر اندھے ہوئے ہیں، سوچ سمجھ کر سننے سے انکار کر رہے ہیں، سوچ سمجھ کر بھلک رہے ہیں، ان کو آپ ﷺ را راست نہیں دکھا سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ہدایت کے باوجود آپ کی یہ کیفیت کہ جو سننے نہیں ان کو

بھی سننے لگ جائیں، جو دیکھنا نہیں چاہتے ان کو بھی دکھادیں، جو جان بوجھ کر بھٹک رہے ہیں ان کو بھی صحیح راستے پر لگادیں، بالکل آئینے کی طرح نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

لوگوں کی ہدایت اور ان کو گرم راہی سے بچانے کے لیے آپ ﷺ اس قدر بے قرار تھے کہ اگر لوگ نہیں مانتے ہیں تو آپ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی نشانی آجائے، جسے دیکھ کر لوگ ایمان لے آئیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ تم آسمان میں سیر ہمی لگا کر چڑھ جاؤ یا زمین کے اندر سرگنگ کھولو اور کوئی نشانی لے آؤ۔ اس میں دراصل جہاں ایک طرف اس بات کا اظہار ہے کہ یہ لوگ اس کے بعد بھی مانے والے نہیں ہیں، وہاں آپ ﷺ کی کیفیت یہ ہے کہ آسمان پر سیر ہمی لگا کر بھی اگر یہ لوگ حق بات کو مانتے ہوں تو ان کو ماننے کی راہ پر لا یا جائے اور زمین میں سرگنگ لگا کر بھی اگر کوئی ایسی بات ہو سکتی ہو تو ہو جائے۔ آسمان پر سیر ہمی لگا کے چڑھنا اور زمین میں سرگنگ لگانا، یہ ہمارے ادب کے عام محاورے ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو

کسی کام کو کرنے کے لیے انہیاں مشقت اور انہیاں کوشش کرنا اور آپ ﷺ اس کے لیے بھی تیار رہتے تھے۔

یہ وہ چیز تھی جس کی وجہ سے داعی ہونا آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی ایک پہلو نہیں تھا بلکہ آپ ﷺ ہمہ وقت اور ہر دم داعی تھے اور اسی کو آپ ﷺ کے سارے کام میں بنیادی ترجیح حاصل تھی۔ جہاد اسی کے لیے تھا، تلوار اسی کے لیے اٹھائی گئی، خطوط اسی کے لیے لکھے گئے۔ ابتداء سے آخر تک سب سے بڑی فکر جو آپ ﷺ کے اوپر غالب تھی وہ یہ تھی کہ اللہ کے بندوں تک یہ پیغام پہنچے اور آپ ﷺ سرخ رو ہو کر اپنے رب کے سامنے حاضر ہوں اور لوگ گواہی دیں کہ ہاں، آپ ﷺ نے ہم تک پیغام پہنچا دیا، آپ ﷺ نے نصیحت کا حق ادا کر دیا اور جو امانت آپ ﷺ کے سپرد ہوئی تھی وہ ہم تک پہنچ گئی۔ اس لیے آپ ﷺ دن رات اسی کام میں لگے رہتے تھے۔

جب آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے سب سے

پہلا کام یہ کیا کہ زمین خریدی اور وہاں ایک چھوٹی سی مسجد بنائی۔ اس مسجد کا فرش سنگ ریزوں کا تھا۔ اس کے ستون کھجور کے درختوں کے تھے۔ فرش پر کھجور کی چھال پچھی تھی۔ اس کے بعد ۱۳ اربس تک آپ ﷺ نے اس طرف توجہ نہیں کی کہ یہ مسجد پختہ ہو جائے، عالی شان عمارت بن جائے بلکہ آپ ﷺ اسی کام کے اندر لگے رہے کہ خدا کا پیغام دلوں کے اندر راخ ہو جائے۔ آپ ﷺ کی کوشش تھی کہ ظاہر میں یہ عمارت شان دار ہو یا نہ ہو لیکن دلوں کے اندر دعوت حق کی عمارت ضرور شان دار تغیر ہو جائے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ کے انتقال کے صرف ۱۰۰ اربس کے اندر اندر اسیں سے لے کر ہندستان تک انتہائی عالی شان مسجدیں وجود میں آگئیں۔ اگر پہلے ہی دن آپ ﷺ کی توجہ دعوت سے ہٹ کر ان کاموں کے اندر لگ جاتی تو اس کا امکان کم تھا کہ وہ قوت وجود میں آتی، جو اس دعوت کے جذبے سے سرشار ہو کر مدینہ سے نکلتی اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس پیغام حق کو اور دعوت کو پہنچاتی۔ یہ دراصل مقام دعوت کے سلسلے میں آپ ﷺ کا اسوہ تھا، جس کو سب سے پہلے سمجھنا ضروری ہے۔

دوسری بات جو جاننا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ مقامیں دعوت کیا تھے، جس پر آپ ﷺ شروع سے آخر تک اپنی توجہ مرکوز کیے رہے۔

آپ ﷺ نے بہت سے کام کیے اور کئی حوالوں سے دعوت دی، آداب کی تعلیم دی، یہ بھی بتایا کہ کیسے کھائیں بیٹھیں اور اٹھیں بیٹھیں، لباس کس طرح پہنیں، لوگوں پر حدود اور سزاوں کا نظام بھی نافذ کیا لیکن شروع سے آخر تک اس سارے کام کے لیے، جو چیز بخوبی کی خیشیت رکھتی تھی، وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ کے بندوں کا تعلق اپنے رب سے قائم کر دیا۔ یہ تعلق کوئی ظاہری تعلق نہیں تھا بلکہ دلی و قلبی تعلق تھا اور اس کے نتیجے میں ان کو بندگی رب کے سانچے کے اندر رہا حال دیا۔

کمی زندگی کے پہلے دن سے لے کر مدنی زندگی کے آخری دن تک آپ ﷺ اس کام سے غافل نہیں ہوئے کہ اللہ کے بندوں کا تعلق اپنے رب کے ساتھ قائم ہو۔ یعنی بندگی کا تعلق، توکل کا تعلق، خیشیت کا تعلق اور محبت کا تعلق،

اپنے آپ کو سپرد کر دینے کا تعلق۔ اقرآن کے نام سے جو کام شروع ہوا تھا، وہ اپنے رب کی تسبیح، حمد اور استغفار کے حکم تک جاری رہا۔ گویا نبی کریم ﷺ کے مشن کی تیکمیل تک جو کام جاری رہا وہ یہی تھا کہ اللہ کے بندے اللہ کے ساتھ جڑ جائیں۔ جب تک وہ اللہ کے ساتھ نہیں جڑیں گے، ان کے اندر وہ قوت اور طاقت نہیں پیدا ہوگی، جو اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے ناجزیر ہے۔

اس دعوت کے اندر اتنی کشش تھی کہ لوگ دوڑ کر آتے تھے اور اسی کے ہو کر رہ جاتے تھے۔ اس لیے کہ خالق کائنات کی بندگی کے اندر جولنت، جونشہ اور جو کشش ہے، وہ کسی اور چیز کے اندر نہیں ہو سکتی۔ اس کی بندگی کی حدود اس دنیا سے ماوراء آخرت تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جو اس کا ہو جاتا ہے، اس کے لیے دنیا کی کوئی قربانی، قربانی نہیں رہتی۔ جان، مال اور وقت، ہر چیز اس کے لیے حاضر ہوتی ہے، اس لیے کہ جس نے اس دعوت کی پکار پہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد

کر دیا، گویا اس نے اپنا سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیا۔ اگر دنیا کے چھوٹے چھوٹے مقاصد لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے رہتے تو ان کی زندگی کے اندر یہ انقلاب کبھی برپا نہ ہوتا اور وہ اس طرح نہ بدلتے۔

بندگی کا یہ تعلق دنیا اور آخرت کے اوپر محيط تھا۔ زمین و آسمان کی ساری وسعت سے زیادہ وسیع یہ تعلق تھا، جو آپ ﷺ نے قائم کیا۔ اس تعلق کے نتیجے میں آپ ﷺ نے آخرت کا طلب گار بنا کر جنت کا خریدار بنادیا۔ فی الواقع یہ بہت بڑا انقلاب تھا، جو نقطہ نظر کے اندر، فکر کے اندر اور دل کے اندر پیدا ہو گیا۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا کے طلب گار نہیں تھے اور جنت کے خریدار بن چکے تھے۔

اس کا بہترین اظہار اس موقعے پر ہوتا ہے جب مدینہ سے بیعت عقبی کے لیے ایک بڑا گروہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیعت کی۔ ان میں سے ایک صحابی حضرت عباس بن عبادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انصار کو مخاطب ہو کر کہا: تم کو معلوم ہے کہ تم کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ اس کے نتیجے میں

تمھاری گردنیں ماری جائیں گی، تمھارے اشخاص قتل ہوں گے، تمھاری عورتیں بیوہ ہوں گی اور لوٹدیاں بنالی جائیں گی۔ انہوں نے پوری تفصیل کے ساتھ تمام ممکنہ خطرات کو گنوایا۔ اس پر انصار نے کہا: ہاں! ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں کیا پیش آنے والا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس بیعت کو دوبارہ دہرا�ا، جس پر انصار نے یہ سوال کیا کہ ہم کو اس کے بدلتے میں کیا ملے گا؟ بعد میں قرآن مجید نے اس پر نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَ فَتْحٌ قَرِيبٌ (القاف: ۴۳) کا مژده بھی سنایا، اور إِنَّا فَتَحْنَا لَكُ فَتْحًا مُبِينًا (الفتح: ۱) کی بشارت بھی دی، نیز مفہوم کثیرہ، بڑی کثرت سے مال کا بھی ذکر فرمایا۔ لیکن اس موقعے پر جان و مال قربان کر کے سب کچھ دے دینے کے عوض میں حضور ﷺ نے فرمایا: اس کے بدلتے میں تمھیں جنت ملے گی اور یہ جواب انصار کے لیے کافی تھا۔ اس کے بعد اپنی جان اور مال کے بدلتے میں ان کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے کہ اللہ کے اوپر ایمان کے معنی وہ یہ سمجھنے چکے تھے کہ سب کچھ اسی جنت کے عوض فروخت کر دینا ہے۔

یہ وہ سیدگی سادگی دعوت تھی، جو ایک بدو، ایک تاجر، ایک ان پڑھ آدمی، ایک چرواہے یا کسی عالم اور پڑھے لکھے کے لیے یکساں طور پر زندگی کے اندر سب سے زیادہ پرکشش دعوت تھی کہ آدمی اپنے خالق کا ہو کر رہے، اس کے ساتھ جڑ جائے، آخرت کا طلب گار ہوا اور جنت کی قیمت کے اوپر اپنے آپ کو راضی کر لے۔

آپ ﷺ کی دعوت کا تیراپہلو یہ تھا کہ جنت دنیا کے گوشوں اور خانقاہوں میں بیٹھ کر حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ زمین پر خدا کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد سے حاصل ہوگی۔ اس جنت کی خوش بوجروں میں نہیں آئے گی بلکہ اس کی خوش بوحد کے پہاڑوں کے پیچے سے آئے گی۔

آپ ﷺ نے جنت کو ایک ایسی حقیقت بنادیا تھا، جس کی انھیں خوش بو بھی آتی تھی۔ چاند گرہن کی مشہور حدیث ہے، اس میں آپ ﷺ نے ایک دفعہ ہاتھ آگے بڑھایا اور پھر پیچھے ہٹالیا۔ بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے پوچھا کہ آپ ﷺ نے کیوں ہاتھ آگے بڑھایا اور پھر پیچھے ہٹالیا؟ آپ ﷺ نے

فرمایا کہ میرے سامنے جنت تھی۔ اگر میں اس کا خوشہ توڑ کے تمہیں دکھا دیتا اور تمہارے درمیان لے آتا تو رہتی دُنیا تک کے انسانوں کی غذا کے لیے یہ کافی ہوتا۔

ان کے لیے جنت کوئی افسانہ نہیں تھی، جس کو وہ قرآن میں پڑھتے تھے اور گزر جاتے تھے، بلکہ ان کے لیے وہ ایک جیتی جاگتی زندہ حقیقت تھی۔ جب وہ نبی کریم ﷺ کو اٹھتے پڑھتے یا منبر کے اوپر کھڑا دیکھتے تو سمجھتے تھے کہ سامنے جنت موجود ہے لیکن وہ جنت جہاد کے اندر پوشیدہ تھی۔ بندگی رب، آخرت کی طلب اور جنت کا تعلق جہاد کے ساتھ جوڑ کے آپ ﷺ نے اسے انسان کی زندگی کے اندر رائخ اور مربوط کر دیا تھا۔ اب یہ جنت کے طلب گاروہ نہیں تھے، جو گوشوں میں بیٹھ کر صرف درس دیں، بلکہ اس کے نتیجے میں ایک ایسی جماعت تیار ہوئی، جو دنیا بھر کو آخرت اور بندگی رب کی دعوت دینے کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ لوگوں کے دل فتح ہو گئے، نسلوں کی نسلیں، قوموں کی قومیں اس دعوت کے گرد جمع ہو گئیں۔

خالق رب کے ساتھ تعلق، آخرت کی طلب اور دنیا کے اندر انسانوں کو

ہدایت پہنچانا اور اس کے لیے کوشش اور جدوجہد، یہ دراصل دعوت کا اصل مضمون تھا، جس کے لیے کسی لمبے چوڑے فلسفے، منطق اور کتابوں کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ وہ بات تھی جس کی ہر آدمی اپنے اندر پیاس محسوس کرتا تھا۔ وہ بدرو، وہ چرو، اور وہ تاجر، جنہوں نے جب اس پیغام کو سننا اور اپنے آپ کو اس دعوت کے حوالے کر دیا، کسی منطق اور فلسفے کے بغیر ہی وہ دنیا کے امام اور لیڈر بن گئے۔

آپ ﷺ کے اسوہ دعوت کا ایک چوتھا پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے دعوت کے لیے وہ کون سے طریقے اختیار کیے کہ اس دعوت نے آپ ﷺ کی قوم کے بڑے حصے کو ایک مختصر مدت میں آپ ﷺ کے گرد جمع کر دیا۔

پہلی بات یہ تھی کہ اس پوری دعوت میں آپ ﷺ کا تعلق انسان سے بہ خشیت انسان تھا۔ انسان کو صحیح راہ پہلانا اور اس کو بتاہی اور گم رائی سے بچانا اور اس عذاب اور اس تکلیف سے، جو اس دنیا کے اندر بھی پیش آنے والی ہے اور آخرت میں

بھی، اس سے خبردار کرنا، جس کے لیے آپ ﷺ نذر بنا کر بھیج گئے تھے، جب کہ کام یابی اور نجات پانے والوں کو بشارت و خوش خبری دینا، اس کے لیے آپ ﷺ بشیر تھے اور یہ آپ ﷺ کا فرض منصبی تھا۔ لوگوں کے دکھ درد باشنا، ان کے کام آنا اور خدمت کرنا اور ان سب پر نمایاں آپ ﷺ کی لگن، سوز اور ترپ تھی، جس نے لوگوں کو آپ ﷺ کی طرف راغب کیا۔ یہ کوئی مجرد بات نہیں تھی کہ جو لوگوں کے سروں کے اوپر سے گزر جاتی، بلکہ آپ ﷺ اس کو اپنے اسوے کے ذریعے، اپنے کردار کے ذریعے، اپنی خدمت کے ذریعے، انسانوں کی زندگی سے مربوط کرتے تھے۔

نبی کریم ﷺ انسانیت کے کس قدر ہم درد، خیرخواہ اور دوسروں کے کام آنے والے تھے، اس کی ایک گواہی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے دی۔ خدا کا پیغام وصول کر کے جب آپ ﷺ غار حراء سے گھبرائے گھر لوٹے اور آتے ہی لیٹ گئے اور کہنے لگے کہ مجھے کپڑا اوڑھادو، مجھے کپڑا اوڑھادو اور فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو حوصلہ اور تسلی دی اور فرمایا

کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ آپ ﷺ تو وہ آدمی ہیں، جو صدر حجی کرتے ہیں، رشتہ داروں اور اقربا کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ بات کرتے ہیں تو حق بولتے ہیں۔ جو لوگ معاشرے کے اوپر بوجھ بنے ہوئے ہیں ان کا بوجھ اٹھاتے ہیں، جن کے پاس وسائل نہیں، جو قیم، بیوہ، غریب، اپانچ اور معدور ہیں، جو کما نہیں سکتے، آپ ﷺ ان کے لیے کما کران کی خدمت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ مہمانوں کا احترام کرتے ہیں اور جو لوگ مشکلات کا شکار ہوں، ان کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہرگز آپ ﷺ کو ضائع نہیں کرے گا۔

یہ نبی کریم ﷺ کے اسوہ دعوت کی ایک تصویر ہے اور آپ ﷺ نے ۲۳ رہس، جو کارنبوت انجام دیا، ان چند جملوں میں اس کی ایک جھلک سامنے آ جاتی ہے۔ جو لوگ انسانوں کی تکالیف، مصائب، پریشانیوں اور ان کی خدمت سے غافل ہوں اور یہ چاہیں کہ محض درس و تقریر اور خطاب سے ہی لوگ دین کی طرف دوڑ پڑیں تو وہ یقیناً سخت غلط فہمی کے اندر بنتا ہیں۔ یہ دعوت اسی وقت عام آدمی کے دلوں کے

اندر راخن ہوگی جب اس کے دائی انسانوں کے ساتھ اپنے آپ کو اس طرح مربوط کریں کہ ان کے دلوں میں، آخرت میں آگ سے بچنے کی فکر بھی پیدا کریں اور ان کے دنیاوی مصائب و تکالیف کو بھی دور کرنے کی کوشش کریں۔ یہ دونوں چیزیں اس دعوت کے اندر سب سے نمایاں ہیں اور لازم و ملزم بھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ آپ ﷺ نے ان کا اعتماد پہلے حاصل کیا اور اس کے بعد اپنی بات پہنچائی۔ جہاں انسان پر اعتماد ہی نہ ہو، وہاں پر بڑی خوب صورت اور اچھی سے اچھی بات بھی رائیگاں چلی جاتی ہے۔

آپ ﷺ کے اوپر لوگوں کا اتنا اعتماد تھا کہ آپ ﷺ پہاڑی پر کھڑے ہو کر پوچھتے ہیں: اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر آرہا ہے تو تم کیا کہو گے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم تمہاری بات پر یقین کریں گے۔ لوگوں کا یہ وہ اعتماد تھا، جو آپ ﷺ کو حاصل تھا۔ لوگ یہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ یہ آدمی ہمارا بدخواہ بھی ہو سکتا ہے۔ اہل مکہ نے آپ ﷺ کی کتنی مخالفت کی، آپ ﷺ کے پیچھے پڑے رہے،

آپ ﷺ کے اوپر کتنا ظلم کیا، آپ ﷺ کا راستہ روکا، کانے بچائے، پھر مارے لیکن لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ خدا نخواستہ آپ ﷺ جھوٹے ہیں یا آپ ﷺ ان کے بدخواہ ہیں۔ ابو جہل تک نے کہا کہ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ ﷺ جھوٹے ہیں۔ مجھے تو یہ شکایت ہے کہ آپ ﷺ نے باپ کو بیٹے سے اور بھائی کو بھائی سے الگ کر کے قوم کو چاڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کے خلاف اور کوئی شکایت نہیں ہے۔ لہذا اعتماد وہ اصل ذریعہ ہے، جس کے حصول کے بعد ہی اپنی دعوت آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔

حضور ﷺ وہ بات پیش کرتے تھے، جس میں مخاطب کے ساتھ نکتہ اشتراک ہوتا تھا۔ اس لیے کہ کوئی ایسی بات، جس کو آدمی بالکل نہ جانتا ہو، اس کے دل میں گھرنہیں کر سکتی۔ یہی نبی کریم ﷺ کا طریقہ تھا اور یہی سارے انبیا کا بھی طریقہ تھا۔ وہ بار بار سوال کرتے تھے کہ بتاؤ زمین اور آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ یہ ایک نکتہ اشتراک تھا اور یہاں سے بات آگے چل سکی کہ جس نے

پیدا کیا اسی کا حکم بھی چلتا چاہیے، اسی کی اطاعت ہونی چاہیے، اسی کے پیچے آدمی کو اپنے آپ کو لگانا چاہیے۔

اس کی ایک عدہ مثال عیسائیوں کے وفے سے نبی کریم ﷺ کا مکالمہ ہے۔ وہ لوگ جس طرح آئے اور مسجد نبوی ﷺ کے اندر پھرے، وہاں ان کو اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرنے کی سہولت دی گئی اور ان کی خاطر مدارت ہوئی اور پھر یہ دعویٰ پیش کی گئی کہ آؤ اس چیز کی طرف، جو ہمارے درمیان مشترک ہے:

فُلْ يَأْهَلَ الْكِتَبِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٌ بَيْنَنَا وَ
بَيْنَكُمْ إِلَّا نَعْبُدُ إِلَّا اللَّهُ وَلَا نُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَلَا
يَتَعَدَّ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ ذُونِ اللَّهِ

(آل عمران: ۶۳)

اے نبی گھو، ”اے اہل کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف، جو ہمارے

اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنارب نہ بنالے۔“

دعوت حق اگر پیش کی جائے تو بڑی مشکل سے کوئی آدمی ملے گا، جو پوری کی پوری دعوت کا مخالف ہو اور پوری کی پوری دعوت کو رد کرنے کے لیے تیار ہو۔ کوئی نہ کوئی دعوت کا پہلوایا ہوگا، جو اس کے اور داعی کے درمیان مشترک ہوگا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے معاٹین کے درمیان مشترک تھا۔ دعوت کے اس بنیادی اصول پر بات کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

آخری چیز آپ ﷺ کا کردار ہے۔ قول کی زبان سے بڑھ کر، کردار کی زبان لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔

اگر آپ کبھی سیرت میں ان واقعات کا جائزہ لیں، جو لوگوں کے قول اسلام اور قبول دعوت حق کے سلسلے میں بیان ہوئے ہیں تو آپ دیکھیں گے وہ لوگ،

جنھوں نے قرآن سنا اور ان کے دل کی دنیا بدل گئی، ان کی تعداد الگبیوں پر گئی جا سکتی ہے، جب کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جنھوں نے نبی کریم ﷺ کو قریب سے دیکھا، آپ ﷺ کی نرمی، شفقت اور محبت کا مزہ چکھا، یا صرف آپ ﷺ کا چہرہ ہی دیکھا اور اس دعوت کے گرویدہ ہو گئے۔ جس طرح لوہا مقناطیس سے چپک جاتا ہے، اسی طرح وہ آکر آپ ﷺ کی ذات سے، آپ ﷺ کی دعوت سے، آپ ﷺ کی جماعت سے چپک گئے۔

ایک واقعہ سے اس کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ ہم کچھ لوگ اونٹ لے کر مدینہ پہنچے اور ہمارا خیال تھا کہ ہم اونٹ فروخت کر کے کھجوریں خریدیں گے۔ ہم مدینہ کے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے، جانور کھڑے تھے اور چارہ کھا رہے تھے۔ اتنے میں ایک شخص آیا۔ اس نے کہا کہ کیسے آئے ہو؟ ہم نے اپنا مقصد بیان کیا۔ ہم آپ ﷺ کو پہچاننے نہیں تھے کہ کون ہیں۔ انھوں نے کہا: اچھا میں نے تمہارا اونٹ خرید لیا۔ اس کی یہ قیمت جو طے ہوئی ہے وہ

تمھیں مل جائے گی۔ آپ ﷺ نے اونٹ کی نکیل تھامی اور شہر کی طرف چل دیے۔

جب آپ ﷺ نگاہوں سے او جھل ہو گئے تو ہم نے سوچا کہ یہ ہم نے کیا کیا۔ نہ ہم آدمی کو جانتے ہیں، نہ اس کا نام پتا معلوم ہے کہ کہاں رہتا ہے اور نہ قیمت ہی وصول کی اور جو مال بیچا تھا وہ بھی لے گیا ہے۔ پتانہیں ملے گا یا نہیں؟ ہمارے سردار کی بیوی جو کہ اونٹ کے ہودج میں بیٹھی تھی، اس نے کہا کہ جس آدمی نے اس اونٹ کو خریدا ہے، اس کا چہرہ اتنا روشن تھا کہ یہ کسی جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ یہ لازماً کسی سچے آدمی کا چہرہ ہے۔ میں اس کی ضمانت دیتی ہوں۔ یہ قیمت تم کو لازماً پہنچ کر رہے گی۔

چند لمحات گزرے تھے کہ ایک آدمی آیا اور پوچھنے لگا کہ کیا تم لوگوں نے اپنا اونٹ فروخت کیا ہے؟ ہم نے کہا: ہاں! ہم نے فروخت کیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ لوہہ قیمت، جو تم نے طے کی تھی اور یہ مزید تمہارے لیے ہے تمہاری میزبانی اور مہمان داری کے لیے۔ اس طریقے سے یہ معاملہ طے ہوا۔

اسی طرح ایک اور قبیلے کی ایک عورت آئی اور واپس جا کر کہا کہ لوگوں! محمد ﷺ کے پیچھے چلو۔ اس لیے کہ ایسا تھی آدمی میں نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کر لوگوں کو دیتے ہیں اور ان کی خدمت کرتے ہیں۔

آپ ﷺ کی سخاوت، آپ ﷺ کی شجاعت، آپ ﷺ کی نرمی، یہ وہ جیز تھی، جو لوگوں کو اس دعوت کے ساتھ، اس پیغام کے ساتھ چپکائے ہوئے تھی۔ قرآن مجید نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے:

فِيمَا رَحْمَةٌ مِنَ اللَّهِ إِنَّهُ لَهُمْ وَلَوْكُنْتَ فَظًا
غَلِيظُ الْقُلُبِ لَا نَفْضُوا مِنْ حَوْلِكَ

(آل عمران ۱۵۹:۳)

”(اے پیغمبر ﷺ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے زم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تندخوا اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔“

یہ بات اس بات کے اوپر گواہ ہے کہ مجرد پیغام کی سچائی کشیر لوگوں کو کسی بھی دعوت کے گرد جمع نہیں کر سکتی۔ جب تک اس دعوت کو پیش کرنے والے اس کردار سے بھی آراستہ نہ ہوں، جو کردار ان لوگوں کے لیے باعث کشش ہو اور فرمی و محبت کا پیغام لے کر آتا ہو۔

بچوں کو سلام کرنا، پرندوں کو کھانا کھانا، خود فاقہ سے رہ کر مہماںوں کی میزبانی کرنا ایسے بہت سارے واقعات ہیں، جو سیرت کے اندر مل سکتے ہیں اور ان سے جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ دراصل وہی بات ہے، جو میں نے شروع میں کہی کہ انسان کی خدمت، انسان کے لیے درد، انسان کے لیے سوچ، انسانیت کا احترام اور فلاج و بہبود اور آخرت کی نجات کی تڑپ اور فکر، نیز لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا اور سہولت دینا ہی اصل اسوہ دعوت ہے۔

آپ ﷺ نے دو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کسی قبلے میں دعوت کے لیے بھیجا تو کہا: دیکھو، نفرت پیدا نہ کرنا۔ بات اس طرح مست کہنا کہ لوگ اپنے رب سے

نفرت کرنے لگیں۔ بات اس طرح کہنا کہ آسانی اور سہولت ہو اور لوگ رغبت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ اس طرح آپ ﷺ نے اپنی دعوت کو زندگی کے ساتھ مربوط کر دیا۔ یہ آپ کی رحمت اور شفقت تھی، جس نے لوگوں کو آپ ﷺ کے چاروں طرف جمع کر دیا۔

اس دعوت میں مقابلہ، لڑائی، کشکش اور جدوجہد بھی تھی، لیکن کشکش اور جدوجہد مشقمانہ ذہنیت کے ساتھ نہیں تھی، یا بدله لینے کی ذہنیت اور فکر کے ساتھ نہیں تھی، بلکہ اس پوری جدوجہد میں ہر وقت یہی فکر غالب تھی کہ یہ لوگ نادان ہیں، یہ جانتے نہیں ہیں، جذبات سے مغلوب ہو چکے ہیں اور جاہلیت کے اندر پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ اگر آج آکر حق کے مقابلے پر کھڑے ہوئے ہیں، اس کی وجہ باطنی خباثت نہیں بلکہ دھوکے اور فریب کے اندر مبتلا ہونا ہے۔ پھر ان کے لیے دعا گوبھی رہے کہ اے اللہ! انھیں ہدایت دے۔

آپ ﷺ کو طائف کے اندر پھر بھی مارے گئے، آپ ﷺ کا خون بھایا

گیا، اس کے باوجود کہ آپ ﷺ لوگوں سے بدلہ لے سکتے تھے اور ان کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس کر چکنا چور کر سکتے تھے، پہاڑوں کا فرشتہ بھی حاضر تھا اور کہہ رہا تھا کہ آپ ﷺ میں تو اس بستی کو پیس کر ریزہ ریزہ کر دوں، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، میں اس بات سے مایوس نہیں ہوں کہ ان کی نسل میں سے ایسے لوگ نہیں، جو ہدایت کے راستے پر آئیں۔

غزوہِ أحد میں آپ ﷺ زخمی ہو گئے، آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہو گئے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ نہیں تھے کہ لوگو! انہو اور اس کا بدلہ لو، بلکہ یہ الفاظ تھے: ”اے اللہ، میری قوم کو سمجھ راستے پر لگا، اس لیے کہ یہ جانتے نہیں ہیں۔ ان کی یہ روشنی اس وجہ سے ہے کہ وہ اس سے واقف نہیں ہیں۔“

اسوہ دعوت کے ضمن میں یہ چند نیادی باتیں ہیں۔ اگر ان باتوں کو آج داعی حق سمجھ لیں کہ دراصل جو کام ہم نے اپنے ذمے لیا ہے اور ہر مسلمان

کو اپنے ذمے لینا چاہیے، یہ اس لیے ہے کہ یہ ہمارا بنيادی فرض ہے، یہ دراصل کا رسالت ﷺ ہے۔ کوئی اور کام اپنی منزل پر پہنچ یا نہ پہنچے، یہ وہ کام ہے، جس کو ہر صورت میں انجام دیا جانا چاہیے۔ یہ بات ہم میں سے ہر ایک کو اپنے سامنے ہمیشہ رکھنی چاہیے کہ میرے گرد و پیش جتنے لوگ ہیں ان کو صحیح راستے پر لانے کے لیے میں جواب دہ ہوں۔ پھر مجھے اس پوزیشن میں ہونا چاہیے کہ زندگی کے کسی بھی مرحلے میں، میں ان سے کھڑے ہو کر پوچھوں، خواہ اپنی بیوی بچوں سے پوچھنا پڑے یا اپنے محلے والوں سے، یا کھیتوں میں کام کرنے والوں سے پوچھنا پڑے یا فیکٹری میں کام کرنے والے مزدوروں سے، یا اپنے کاروبار یا ملازمت میں ساتھ کام کرنے والوں سے پوچھنا پڑے کہ کیا میں نے تم تک حق کا پیغام پہنچا دیا ہے، تو لوگ کہیں کہ ہاں، پہنچا دیا ہے۔ مانتا یا نہ مانتا یہ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ان کا اپنا فعل اور اپنا امتحان ہے۔ ہم کتنا ہی چاہیں، چاہے اس کے لیے اپنی جان ہی گھلاڑا لیں:

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَخْبَتْ وَ لِكُنَّ اللَّهُ يَهْدِي مَنْ

(القصص: ٥٦)

یَشَاءُ عَ

”اے نبی ﷺ، تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے
چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔“

گویا یہ تمھارے ہاتھ میں نہیں کہ تم صرف اپنے چاہنے اور خواہش سے
لوگوں کو صحیح راستے پر لگاسکو۔ لوگوں کا اپنا ارادہ اس کے اندر بندیادی چیز ہے۔ توفیق بھی
چاہنے پر ملتی ہے:

اللَّهُ يَجْعَلُ بِّيِّ إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَ يَهْدِي بِيِّ إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ ۝

(الشوریٰ: ١٣)

”اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کریتا ہے، اور اپنی طرف آنے کا راستہ اُسی کو
دکھاتا ہے، جو اس کی طرف رجوع کرے۔“

ذُنْيَا کے اندر نظامِ حق قائم ہو یا نہ ہو، یہ بھی ہماری ذمہ داری نہیں۔ نظامِ حق

کے لیے کام کرنا ہم پر فرض ہے لیکن اس کو قائم کر دینا یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ خدا کے بے شمار انبیا تھے، جو دنیا سے رخصت ہو گئے، بر سہابہ کی جدوجہد کے بعد رخصت ہوئے، مگر ان کی قوموں نے ان کی بات مان کر نہیں دی۔ وہ اپنی آنکھوں سے اس نظام کو قائم ہوتا نہیں دیکھ سکے۔ قرآن مجید نے خود فرمایا:

وَإِنْ مَّا نُرِينَكَ بَعْضَ الَّذِي نَعْدِهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيْنَكَ
فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ (الرعد: ۳۰)

”اور اے نبی ﷺ، جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتنے جی دکھادیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھائیں، بہر حال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔“

گویا حساب لینا اللہ تعالیٰ کی ذمے داری ہے اور پہنچانا ہماری ذمے داری ہے۔ پہنچانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جس طرح چاہا پہنچا دیا اور فرض ادا ہو گیا، بلکہ اس سے

راد حکمت کے ساتھ، خوب صورتی کے ساتھ، دل کو مودہ لینے والے طریقوں کے سے ہم نجی نہیں سکتے، جس کی جواب دہی ہم کو کرنا پڑے گی۔ ہر مسلمان کو یہ جواب دہی عام انسانوں تک دعوت پہنچانے کے حوالے سے کرنا پڑے گی۔ اپنے ساتھ چلنے پھرنے والے مسلمانوں کے حوالے سے کرنا پڑے گی۔ یہ جواب دہی اس حوالے سے بھی ہے کہ جو لوگ اس نعمت، اس ہدایت اور اس ذمے داری سے واقف نہیں تھے، آیا ہم نے ان کے سامنے اس کو پیش کیا یا نہیں۔

واضح رہے کہ یہ کام کسی دنیاوی اجر یا صلے کی طلب میں نہیں ہو سکتا۔ انبیاء کرام اور خود نبی کریم ﷺ نے اس بات کو کھول کر بیان کیا ہے:

وَمَا أَسْتَلِكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى

رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝
(ashra: ۱۰۹)

”میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمے ہے۔“

میں اپنی بات کو اس حدیث کے اوپر ختم کروں گا، جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے روز ایک آدمی بارگاہِ رب میں حاضر ہو گا اور اس سے اللہ تعالیٰ پوچھئے گا کہ میں بھوکا تھا، تم نے مجھے کھانا کیوں نہیں دیا؟ وہ کہے گا کہ پور دگار تو سارے جہانوں کا رب ہے۔ تو بھلا کہاں بھوکا ہوتا اور مجھ کو کھانا کیسے دیتا؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا فلاں بندہ بھوکا تھا اور تو نے اس کو کھانا نہیں دیا۔ اسی طریقے سے وہ اس سے بیمار ہونے کے بارے میں سوال کرے گا، اور اس کے پیاس سے ہونے کے بارے میں سوال کرے گا۔ احادیث میں مختلف چیزیں مختلف روایات میں بیان ہوئی ہیں۔ لیکن وہ تمام انسانوں کی مادی ضروریات ہیں، یعنی کھانا، پینا، لباس، دوا کہ جن پر اس کی دُنیا کی فلاج اور بھلائی کا انحصار ہے۔ اس سے جہاں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ کے بندوں کی یہ ساری ضروریات پوری کرنے کے بارے میں سوال کیا جائے گا، وہاں آپ یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ پھر کیا یہ سوال نہیں ہو گا کہ میرا فلاں بندہ گم راہ ہو کر جہنم کی راہ پر جا رہا تھا، تو نے اس کو کیوں نہیں بچایا۔ یہ سوال

اگر کیا جائے گا تو اس سوال کا جواب ہمارے پاس تیار ہونا چاہیے اور یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے بارے میں قرآن نے گواہی دی ہے:

وَ يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُجَّهٖ مِسْكِينًا وَ يَتِيمًا وَ
آسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ
بَزَاءً وَ لَا شُكُورًا ۝
(الدھر: ۸، ۹)

اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ”ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلارہ ہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔“

اگر دعوت پر خلوص ہو اور اس کے پیچھے یہ روح اور جذبہ کا فرمایہ ہو، اس کی ہر وقت اور ہر دم لگن ہو، اس کے ساتھ اپنے بھائی کے لیے سوز اور تڑپ ہو اور اس کا دکھ درد بانٹنے کی کوشش ہو، اور پھر یہ سب کسی اجر یا صلح کے لیے نہ ہو بلکہ اس لیے ہو کہ ہم

نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ، بلکہ کھانا بھی اسی لیے کھلاتے ہیں اور دعوت کا کام بھی اسی لیے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہو اور ہماری اس کے سامنے جلت قائم ہو جائے۔ اس کیفیت کے ساتھ، اس جذبے کے ساتھ، اس پیغام کو لے کر اگر آپ ذمہ داری کے ساتھ، اپنے گاؤں میں، اپنے محلے میں، اپنی تحصیل میں، اپنے ضلع میں کھڑے ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ چند برسوں کے اندر اندر یہ پیغام عام نہ ہو اور انسانوں کی کثیر آبادی کم سے کم اس سے واقف نہ ہو جائے۔ ماننا یا نہ ماننا، دلوں کا موڑنا اور نہ موڑنا، یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔
